قانونِ وصیّت
ایک تقابلی مطالعہ

چوھدری عارف محمود، گورنمنٹ ڈگری کالج سیالکوٹ

سر ہنری مین Sir Henry Man نے اپنی مشہور کتاب 'قدیم قانون' Ancient Law میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ تاریخ قانون میں عام انسانی تعلقات کی بہتر و خوشحالی پر جس قدر معاہدہ Contract اور وصیّت (Will) کے نظریات نے اثر ڈالا ہے شاید ہی کسی اور قانون نے ڈالا ہو[1]۔ مین کی رائے کی بنیاد غالباً وہ نقطۂ نظر ہے جو وصیّت کو خاندان کے ارکان کے لیے بہتر انتظام کے طور پر بلاوصیتی جانشینی (Non-Testamentary Succession) پر ترجیح دیتا ہے۔ گویا وصیّت خاندان کے ارکان کے لیے بہتر انتظام کی ایک صورت ہے۔

تاریخی طور پر وصیت کا ذکر عہد قدیم سے ملتا ہے۔ بابل و آشور اور قدیم مصر کی تہذیبیں اس کے نام سے آشنا تھیں مگر اس زمانے میں وصیّت کی شکل و ہئیت موجودہ وصیّت سے بالکل مختلف تھی۔ یعنی وصیت جائیداد متوفی کی تقسیم کا ذریعہ نہ تھی بلکہ منجملہ اور طریقوں کے خاندان کی نمائندگی کو ایک سردار کی طرف منتقل کرنے کی ایک صورت تھی جس کے نتیجے میں جائیداد پر تصرّف و اختیار بھی حاصل ہو جاتا تھا۔ باضابطہ شکل میں قانون وصیت کی ایجاد کا اعزاز خاص طور پر اہلِ روما کا حصّہ ہے۔ مگر قانونِ روما اپنے ضابطوں کے لحاظ سے بے حد پیچیدہ اور دور از کار تھا یہودیوں کا قانونِ وصیّت بھی اہل روما کے قانون کے زیر اثر معلوم ہوتا ہے۔ برطانیہ میں ابتداً تو قانونِ روما کے اصول ہی اہلِ کلیسا کے منظورِ نظر رہے البتہ سترھویں صدی میں "توریت بہ بنائے وصیت"

---

[1] بحوالہ تنزیل الرحمٰن، ڈاکٹر، مجموعہ قوانینِ اسلام، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد، ۱۹۶۵ء ص ۱۱۸۱

کا قاعدہ قائم ہوا۔ پھر جدید قانونِ وصیت کی بنیاد اسٹیچیوٹ آف ولس ۳۵، ہنری ہشتم کے عہد میں پڑی اور اور برطانیہ میں وصیت کا موجودہ قانون ۱۸۳۸ء کے وصیّت ایکٹ سے ماخوذ ہے۔

ہندو بنگال کے دیا بھاگا مکتبہ قانون میں اختیارِ وصیت کے کچھ غیر نمایاں نشانات کے ماسوا ہندوؤں کے دھرم شاستر میں حقیقی وصیت کا کہیں پتہ نہیں۔ اب ہندوستان میں ۱۹۵۶ء کے ہندو جانشین ایکٹ کے ذریعے وصیّت کے معاملات طے کیے جاتے ہیں۔

اسلامی قانونِ وصیّت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابتدا ہی سے اپنے تمام پیش رو (اور بعد میں آنے والے) قوانین کے مقابلہ میں ایک منفرد مکمل اور جامع قانون ہے مثال کے طور پر اسلام مرد و عورت دونوں کو وصیّت کرنے کا حق عطا کرتا ہے اس کے برعکس انگلستان میں ۱۸۸۳ء تک ایک شادی شدہ عورت کو سرے سے اپنے نام یا حق میں جائیداد خریدنے یا رکھنے کا حق ہی نہیں تھا۔ وصیّت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسپین کے قانون میں انیسویں صدی میں عورت کو چند رعایتیں ملیں اور خود قانونِ روما میں عورت کے حق پر بہت بندشیں عائد تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے نہ صرف اس سلسلے میں ایک جامع قانون دیا بلکہ اسلامی قانونِ وصیت اپنے اخلاقی اوصاف کی بنا پر دیگر قوانینِ وصیّت سے بدرجہا بلند و برتر ہے اور اسلامی قانونِ وصیّت میں انسانی فطرت کے تقاضوں کے بموجب خاندانی یکجہتی کے ساتھ معاشرتی بہبود اور صلہ رحمی کا جو تصوّر ملتا ہے وہ دوسرے قوانین میں ناپید ہے۔

وصیۃ مادہ "و۔ص۔ی" سے اسم مصدر ہے جسکے معنی آنے والے واقع سے متعلق خصوصاً مرنے والے کا کسی کو کچھ سمجھانا[۱] بقول صاحب لسان العرب، میّت کے حکم سے اتصال کی بنا پر اسے وصیّت کہتے ہیں[۲]

امام راغب اصفہانی کے مطابق اس کا اشتقاق 'ارض واصیۃ' (باہم گھنی ہوئی گھاس مالی زمین) سے ہے[۳] وصیّت کے لغوی معنی، اتصال، یعنی ایک شے کے دوسرے تک پہنچنے یا ملنے کے ہیں

۱؎ الزبیدی محمد مرتضیٰ، تاج العروس من جواہر القیاس، منشورات دار المکتبۃ الحیاۃ بیروت، لبنان، ج ۱۰، ص ۳۹۲

الجوہری، علامہ، الصحاح فی اللغۃ والعلوم، دار الحضارۃ العربیۃ، بیروت، ج ۲، ص ۶۹۵

۲؎ ابن منظور، ابوالفضل جمال الدین محمد بن مکرم، لسان العرب، دار صادر بیروت، ج ۱۵، ص ۳۹۴

۳؎ راغب الاصفہانی، ابوالقاسم الحسین بن محمد، المفردات فی غریب القرآن، دار المعرفۃ، بیروت، لبنان، ص ۵۲۵

کبھی کبھی موصی بہ کو بھی وصیّت کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ میّت کے معاملے متصل ہوتا ہے[1]

شریعتِ اسلام میں وصیۃ (یا ایصاء) ایسی تملیک کو کہتے ہیں جس کی نسبت مرنے کے زمانے کی طرف ہو۔ اس سے مراد تملیک لبطور تبرع ہے یعنی لبطور احسان (بلا عوض) موت کے بعد مالک کر دینا اور مرنے والا جس چیز کا مالک کرتا ہے خواہ وہ خود عین (ذات) سے ہو یا عین شئے سے حاصل ہونے والی منفعت[2] اس لفظ کے معنی فقہاء کی اصطلاح میں از روئے مسالک مختلفہ تفصیل طلب ہیں۔ مثلاً:

حنفیہ کہتے ہیں کہ وصیّت نام ہے "تملیک" کا۔ ابن نجیم اور داماد آفندی کے مطابق "تبرع کے طریقہ پر کسی شخص کو اپنے مرنے کے بعد کے زمانہ کی طرف نسبت کر کے اپنے مال کا مالک بنانا وصیّت کہلاتا ہے[3] صاحب کنز الدقائق کے نزدیک کسی شخص کا اپنے مرنے کے بعد کے زمانہ کی طرف نسبت کر کے کسی کو مالک بنایا وصیّت ہے[4]

اور بقول امام علاؤ الدین الکاسانی "وصیّت یہ ہے کہ وصیت کرنے والا اپنی موت کے بعد زمانہ کے لیے اپنے مال میں کسی تصرف کو واجب قرار دے[5]"

حنابلہ کہتے ہیں کہ وصیّت کرنا اپنی موت کے بعد کسی شئے پر تصرف کرنے کی اجازت یا حکم دینا ہے[6]۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ وصیت کسی شخص کے حق میں بخشش کرنا ہے جس پر (عملدرآمد) کو موصی کی وفات

---

[1] الزبیدی، تاج العروس، ج ۱۰، ص ۳۹۲

[2] نسفی محمود، کنز الدقائق، مطبوعہ مجتبائی، دہلی، ص ۴۷۶

[3] ابن نجیم زین العابدین، البحر الرائق، مطبوعہ مصر، ج ۸، ص ۴۰۳
آفندی، داماد، مجمع الانہر، مطبوعہ مصر، ج ۲، ص ۶۹۱

[4] نسفی محمود، کنز الدقائق، ص ۴۷۶

[5] فالوصیۃ اسم لما اوجبہ الموصی فی مالہ بعد موتہ وبہ تفصل عن البیع والاجارۃ والھبۃ لان شیئاً من ذالک لایحتمل الایجاب بعد الموت الاتری انہ لو اوجبھا بعد الموت بطل "
الکاسانی، علاؤ الدین ابی بکر بن مسعود، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ایچ۔ ایم۔ سعید کمپنی کراچی، ۱۴۰۰ھ، ج ۷، ص ۳۳۳۔

[6] المقدسی شرف الدین: الاقناع، ج ۳ ص ۱۴۷ طبع مصر

کے بعد سے نسبت کیا گیا ہے خواہ اس نسبت کو الفاظ میں بیان کر دیا جائے یا نہ کیا جائے[1]
عبدالرحمٰن الجزیری کے بقول مالکی فقہاء کی اصطلاح میں وصیت ایک عقدِ معاملہ ہے جس کی رو سے وصیّت کرنے والے کے ایک تہائی مال میں اس کی وفات کے بعد کسی کا حق واجب ہو جاتا ہے یا اس کے بعد (اس مال میں) اس شخص کو (متوفی کی) نیابت حاصل ہوتی ہے[2] اور شیعی فقہاء کے مطابق کسی شخص کا اپنی وفات کے بعد کے لیے کسی شئے کی ذات یا منفعت کا کسی شخص کو مالک بنانا وصیّت کہلاتا ہے[3]

جہاں تک وصیّت کے جواز کا تعلق ہے تو قانونِ انتقال ملکیّت کے لحاظ سے اس کا حکم شرعی ہونا کتاب وسنت سے ثابت ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت اِن ترک خیراً ان الوصیة للوالدین والاقربین بالمعروف[4]

اور سنت سے اس کا ثبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ہے کہ:

عن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنه انّ رسول اللہ علیه صلی اللہ علیه وسلم قال ماحق امرأ مسلم له شئ یوصی یبیت لیلتین الاوصیة متکوبة عندہ[5]

اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ یہ امر احتیاط اور رائے درست سے بعید ہے کہ کسی کے پاس قابلِ وصیّت مال ہو اور دو رات (یعنی تھوڑے عرصے تک بھی اس کی بابت وصیّت لکھکر اپنے پاس نہ رکھی ہو۔

---

[1] الجزیری، عبدالرحمٰن، کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ، المکتبہ دارالفکر، بیروت ۱۹۶۱ء ج ۳، ص ۲۵۸

[2] ایضاً، ص ۳۱۵

[3] المحلی، نجم الدین، شرائع الاسلام، مطبوعہ بیروت، القسم الثانی، ص ۲۵۸

[4] البقرة، ۲: ۱۸۰

[5] البخاری: الجامع الصحیح: ج ۱ ص ۲۸۳ اصح المطابع کراچی۔

اس حدیث میں لفظ لیلتین (یعنی دو رات، آیا ہے اس سے تعداد میں دو راتیں مراد نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ جلد از جلد وصیت لکھ کر رکھنے کی ترغیب ہے۔

امام الکاسانیؒ نے وصیّت کے جواز میں کئی دوسری آیات و احادیث کا حوالہ بھی دیا ہے[1]

قرآن و حدیث پر مجموعی نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ وصیّت کی فرضیت کا یہ حکم ابتدائے دورِ اسلام کا ہے۔ جبکہ ابھی وراثت کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے اور چونکہ دورِ جاہلیت میں وراثت کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ طاقتور پس ماندگان کا فطری حق ہے۔

---

[1] مثلاً آیات: النساء ۴: ۱۱، ۱۲ - المائدہ ۵: ۱۰۶

اسی طرح مندرجہ ذیل احادیث بھی اس سلسلے میں وارد ہیں۔

عن سعید بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ قال جاء النبی صلعم یعودنی وانا بمکۃ وھو یکرہ ان یموت بالارض التی ھاجر منھا قال یرحم اللہ ابن عفراء، قلت یارسول اللہ اوصی بمالی کلہ قال لا، قلت الشطر قال لا، قلت فالثلث، قال الثلث والثلث کثیر انک ان یدع ورثتک اغنیاء خیر من ان تدعھم عالۃ یتکففون الناس فی ایدیھم۔

البخاری محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، ج ۱، ص ۳۸۴

ابوداود، سلیمان بن اشعث، سنن ابی داود، ج ۲، ص ۳۹۵

عن جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلعم من مات علی وصیۃ مات علی سبیل وسنۃ ومن وشھادۃ مات مغفوراً لہ۔

ابن ماجہ، ابن عبداللہ، محمد بن یزید القزوینی، سنن ابن ماجہ، مطبوعہ اصح المطابع کراچی، ص ۱۹۴

عن معاویۃ بن قرۃ عن ابیہ قال قال رسول اللہ صلعم من حضرتہ الوفاۃ فاوصی وکانت وصیۃ علی کتاب اللہ کانت کفارۃ لما ترک من زکوٰۃ فی الحیوٰۃ۔

ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، ص ۱۹۴

عن عطاء عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلعم ان اللہ تصدّق علیکم عند وفاتکم بثلث اموالکم زیادۃ لکم فی اعمالکم،

ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، ص ۱۹۴

اسی بنا پر ترکے سے کمزور رشتے داروں کو محروم کر دیا جاتا تھا۔ اس صورتِ حال کی اصلاح کے لیے پہلے حکم دیا گیا کہ مرنے والے کو اپنے مستحق رشتے داروں کے حق میں وصیت کرنی چاہیے۔ بعد ازاں سورۃ النساء میں وراثت کے تفصیلی احکام بیان کر دیے گئے، چنانچہ اس وضاحت کے آ جانے کے بعد اس بارے میں وصیت کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اسی بنا پر آنحضرت صلعم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ نے ہر صاحبِ حق کو اس کا حق دے دیا ہے پس اب کسی وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں[1]

اس مضمون کو بعض مفسرین نے اس طرح بیان کیا ہے کہ اول الذکر آیت سورہ النساء کی آیات سے منسوخ ہے[2] بعض علمائے تفسیر نے قرآنی آیت کی بجائے محولا بالا فرمانِ نبوی صلعم کو ناسخ قرار دیا ہے جس کا درجہ حدیثِ متواترہ کا ہے[3]۔ جبکہ بعض تفاسیر میں نسخ کی نسبت اجماعِ امت کی طرف کی گئی ہے[4]

مفسرین کے ایک دوسرے طبقے نے ان دونوں آیات کو ناسخ و منسوخ ماننے کی بجائے انہیں ایک دوسرے کی توضیح و تشریح پر محمول کیا ہے۔ مشہور مفسر امام فخر الدین رازی ابو مسلم الاصفہانی کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ سورہ البقرہ کی محولا بالا) آیت کی سورۃ النساء کی آیت سے تشریح کی گئی ہے۔ اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ جن رشتہ داروں کو وراثت کے مقررہ راستے سے حصہ نہیں ملتا (مثلاً کافر رشتے دار) انہیں وصیت کے ذریعے اس کا حقدار بنایا جائے۔ امام رازی نے اکثر مفسرین اور فقہائے معتبرین کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی ہے[5] متاخرین میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے[6]

---

1. احمد بن حنبل، مسند، المکتبۃ الاسلامی بیروت، حدیث ابی قلابہ۔ آلوسی، ابو الثنا، محمد شہاب الدین، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، احیاء التراث العربی، بیروت ج ۱، ص ۵۳
2. ابو محمد الحسن بن مسعود، معالم التنزیل، قاہرہ، ۱۳۴۶ھ ج ۱، ص ۳۹۶
ابن کثیر، عماد الدین، تفسیر القرآن العظیم، دار المعرفۃ، بیروت لبنان ۱۹۶۹ء، ج ۱، ص ۲۱۱
3. آلوسی، روح المعانی، ج ۲، ص ۵۳
4. پانی پتی، محمد ثناء اللہ، تفسیر المظہری، ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۳۳۵ھ ج ۱، ص ۱۸۲
5. الرازی، امام فخر الدین، التفسیر الکبیر، دار الکتب العلمیہ، طہران، ج ۵، ص ۵۸ تا ۶۲
6. ولی اللہ شاہ، الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، اردو ترجمہ، رشید احمد انصاری، نذیر سنز لاہور ص ۱۸

جہاں تک اس مسئلے پر علمائے امت کی رائے کا تعلق ہے تو اس بارے میں امام الکاسانیؒ لکھتے ہیں:
رہا اجماع تو امت کے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر آج تک وصیّت کرتے آرہے ہیں بغیر اس کے کہ کبھی کسی نے اس سے اختلاف کیا ہو۔ لہٰذا اس پر امت کا اجماع ہے۔ قرآن حکیم، سنّت کریمہ اور اجماع کی موجودگی میں قیاس کو ترک کر دیا جاتا ہے[1] کیونکہ قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ وصیّت جائز نہ ہو کیونکہ یہ تملیک ہے جس کی اضافت بعد از موت ملکیّت کو زائل کر دیتی ہے۔ سو یہ اضافت ملکیت کے زائل ہونے کے زمانے کے ساتھ قائم ہوتی ہے لہٰذا اس کا تملیک واقع ہونا متصور نہیں۔ اس لیے یہ (یعنی وصیّت) درست نہیں۔ البتہ قیاس کی ایک نوع اس کے جواز کی متقاضی ہے اور وہ یوں کہ اس امر کی حاجت ہے کہ انسان کے اعمال کا خاتمہ سابقہ نیکیوں سے زیادہ نیکی پر ہو۔ جیسا کہ حدیث ابن امر کی ناطق ہے یا پھر یہ کہ اس کی زندگی میں جو کوتاہی ہوئی اس کی تلافی ہو جائے اور ایسا وصیّت کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ یہ معاملات محض بندوں کی حاجات کے پیش نظر ہی مشروع ہوئے ہیں۔ لہٰذا جب وصیّت کی حاجت درپیش ہو تو اس کے جواز کا قبول کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کی ملکیّت اس کی موت پر اس قدر مال پر سے زائل نہیں ہوتی جس قدر کی اسے حاجت ہوتی ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ اس قدر مال میں اس کی ملکیت برقرار رہتی ہے جس قدر اس کے کفن دفن کی تیاری کے لیے درکار ہو اور اس قدر مال میں بھی برقرار رہتی ہے جس قدر کہ قرض ادا کرنے کے لیے درکار ہو۔ جس کا مطالبہ بندوں کی طرف سے کیا جائے۔ کیونکہ اس کی حاجت ہے۔ تو ایسے ہی وصیّت میں ہوگا۔[2]

جہاں تک حکم وصیّت کا تعلق ہے تو ائمہ اربعہ نے وصیّت کو ایک امر مستحب قرار دیا ہے۔[3] البتہ مذاہب اربعہ کے اس اجتماعی نقطہ نظر کے برخلاف ظاہریہ مسلک وصیّت کے وجوب کا قائل نہیں ہے۔[4]

---

[1] .... وامّا الاجماع فان الامة من لدن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم الی یومنا هذا یوصون من غیر انکار من احد فیکون اجماعا من الامة علی ذالك والقیاس یترك بالکتاب العزیز والسنة الکریم والاجماع۔
الکاسانی علاؤ الدین، بدائع الصنائع ترتیب الشرائع، ج ۷، ص ۳۳۰

[2] الکاسانی، علاؤ الدین، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ج ۷، ص ۳۳۰

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

فقہاء مذاہب اربعہ نے کہا کہ عملِ وصیّت کی شرعی حیثیت حالات کے مطابق مختلف ہوتی ہے کبھی تو وصیّت واجب ہوتی ہے اور کبھی مستحب ہوتی ہے اور کبھی حرام ہو جاتی ہے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ بہ اعتبار وصیّت کنندہ کے وصیّت کی چار قسمیں ہیں۔ وصیّت واجبہ (جو حقداروں کے حقوق کی ادائیگی کے لیے کی جائے) وصیّت مستحب (جس کا تعلق حقوق اللہ سے ہے) وصیت مکروہ (جو فاسق اور گنہگاروں یا بری باتوں اور گمراہی میں پڑے ہوئے لوگوں کے حق میں کی جائے) وصیّتِ مباح (جو خوش حال رشتہ داروں اور کنبہ والوں کے حق میں کی جائے)[1]

شافعیہ کہتے ہیں کہ بہ اعتبار احکام شرعیہ کے وصیّت کی پانچ قسمیں ہیں۔ وصیتِ واجب (ان اشیاء کے متعلق وصیّت کرنا جو امانت کے طور پر اس کے پاس ہوں اور یا اس کے ذمہ ایسا قرض ہے جس کا دوسروں کو علم نہ ہو) وصیّت حرام (کسی سرکش فسادی کے حق میں وصیّت ہو) وصیّت مکروہ (جو وصیت ایک تہائی مال سے زیادہ میں ہو یا کسی وارث کے حق میں ہو) وصیّت مستحبہ (جو وصیّت کی شرائط پوری کرتی ہو لیکن واجب اور حرام یا مکروہ نہ ہو) وصیّت مباح (کسی دولت مند کے حق میں وصیّت کرنا)[2]

حنابلہ کہتے ہیں کہ وصیّت کی پانچ قسمیں ہیں۔ وصیّتِ واجب (کسی کے حق یا فریضۂ عبادت کیلیے) وصیّت مستحب (کسی ایسے محتاج قرابت دار کے حق میں وصیّت جسے ورثہ میں کوئی حصہ نہ ملے) وصیّت مکروہ (کسی ایسے شخص کا وصیّت کرنا جس نے زیادہ مال نہ چھوڑا ہو اور وارث کے بارے میں ہو) وصیّت مباح (محولہ بالا تمام اقسام کے علاوہ کوئی وصیت)[3]

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ)[3] السرخسی، ابوبکر محمد بن سہیل، المبسوط، مطبوعہ مصر، ج ۲۷، ص ۱۲۲،
سحنون، امام، المدونۃ الکبریٰ، مطبوعہ مصر، ج ۱۵، ص ۳۳
شافعی، امام محمد ادریس، کتاب الام، الطبعۃ الاولیٰ، مصر، ۱۳۲۲ھ ج ۲ ص ۸۹
المقدسی، شرف الدین، الاقناع، مطبوعہ مصر، ج ۳، ص ۸۴
[4] ابن حزم، ابو محمد علی بن احمد، المحلی، مطبع النخریہ، قاہرہ، ۱۳۴۷ھ، ج ۶، ص ۳۸۱
[1] الجزیری، عبدالرحمٰن، کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۳، ص ۳۳۶
[2] الجزیری، عبدالرحمٰن، کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ، ج ۳، ص ۳۲۶ [3] ایضاً

مالکیہ کے نزدیک وصیّت کی پانچ اقسام ہیں، وصیت واجب (کسی قرض یا امانت کے بارے میں جس کا علم اسی کو ہے) وصیّت حرام (جو کسی امرِ حرام کے لیے کی جائے مثلاً میّت پر نوحہ و ماتم کے لیے) وصیّت مستحبہ (جو عبادت واجب الاداء کے لیے کی جائے) وصیّت مکروہ (جس کا مال تھوڑا ہو اور وارث موجود ہو) وصیّت مباح (وہ وصیّت جو امرِ مباح کے لیے کی جائے)

مالکیہ میں سے بعض اصحاب نے وصیّت کی صرف دو ہی قسمیں بتائی ہیں۔ وصیّت واجب جو کسی سے کچھ لینے یا دینے کے معاہدے کے بارے میں) اور وصیّت مستحب (یعنی باقی تمام وصیتیں) [۱]

جہاں تک وصیّت کے رکن کا تعلق ہے تو اس بارے میں اختلافِ رائے پایا جاتا ہے ہمارے تینوں ائمہ رحمہم اللہ کا کہنا ہے کہ اس کا رکن ایجاب وقبول ہے البتہ امام زفرؒ کا کہنا ہے کہ رکن صرف موصی کی طرف سے ایجاب ہے [۲] قبول کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ وہ صراحتاً ہی ہو بلکہ وہ دلالۃً بھی ہو سکتا ہے۔ احناف نے یہ بھی کہا کہ اگر موصی لہٗ کی موت وصیّت کو رد کرنے سے پہلے واقع ہو جائے تو اس کی یہ موت دلالۃً قبول متصوّر ہوگی۔ اور وہ بھی موصی بہٖ کا مالک متصور ہوگا۔ اور پھر اس کی ملکیّت اس کے ورثاء کی طرف منتقل ہو جائے گی [۳] وصیّت کے قبول یا رد کرنے کا وقت موصی کے انتقال کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے موصی کی موت سے پہلے قبول یا رد کا کوئی اعتبار نہ ہوگا حتیٰ کہ اگر موصی کی زندگی میں موصی لہٗ نے وصیّت کو رد کر دیا لیکن موصی کی موت کے بعد قبول کر لیا تو یہ قبول صحیح ہوگا۔ کیونکہ وصیّت کا ایجاب معنًا موت

۱ـ الجزیری، عبدالرحمٰن، کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ، ج ۳، ص ۳۲۶

۲ـ "واما رکن الوصیۃ فقد اختلف فیہ قال اصحابنا الثلاثۃ رحمہم اللہ ھو الایجاب والقبول الایجاب من الموصی والقبول من الموصی لہ فما لم یوجد اجمیعًا لا یتم الرکن وان شئت قلت رکن الوصیۃ الایجاب من الموصی وعدم الرد من الموصی لہ وھو ان یقع الیأس عن ردہ وھذا اسھل لتخریج المسائل علی ما تذکر وقال زفر رحمہ اللہ الرکن ھو الایجاب من الموصی فقط......"

الکاسانی، علاؤ الدین، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ج ۷، ص ۳۳۲ - ۳۳۱

۳ـ الابیانی، زید، شرح الاحکام الشرعیۃ، مطبوعہ مصر، ج ۲، ص ۲۸۹ کتاب الوصیۃ۔

کے بعد مؤثر ہوتا ہے۔ لہٰذا اسی وقت قبول بھی معتبر ہوگا۔ (بدائع الصنائع : ۷ : ۳۳۳)

حنفیہ کی طرح مالکیہ[1]، شافعیہ[2]، حنبلیہ[3] اور شیعی[4] مسلک میں بھی ایجاب وقبول رکن ہے موصی کی عبارت ایجاب ہے اور موصی لہٗ کی عبارت قبول۔ قبول کے بغیر وصیّت تام نہ ہوگی۔ اور اس طرح ان چاروں مذاہب میں بھی موصی کی زندگی میں قبول یا ردّ کا اعتبار نہ ہوگا۔ بلکہ موت کے بعد اس کا اعتبار ہوگا۔ ابن رشد نے امام مالکؒ کے نزدیک موصی لہٗ کے قبول کو مطلقاً وصیّت کی شرط کے طور پہ بیان کیا ہے۔ موصی لہٗ معین یا غیر معین کی کوئی تخصیص نہیں کی[5]۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ وصیت ثابت کرنے کے لیے شہادت ضروری ہے۔ قرآن پاک کی آیت:

"شهادة بينكم اذا حضر احدكم الموت حين الوصية اثنان ذوا عدل منكم"[6]

اس مسئلہ میں نص ہے۔

فقہاء نے اس سلسلے میں کہا ہے کہ دو عادل مرد گواہوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی قبول ہوگی[7]۔ لیکن بوقت ضرورت مسلمان شاہدوں کے نہ ملنے کی صورت میں شیعی فقہاء کے نزدیک خاص طور

---

[1] الابی، صالح عبد السمیع، جواہر الاکلیل شرح مختصر خلیل، مطبوعہ مصر، ج ۲، ص ۳۱۷

[2] الشیرازی، الفیروزآبادی، المہذب، مطبوعہ مصر، ج ۱، ص ۴۵۰، ۴۵۹، ۴۶۱؛
شافعی امام، کتاب الام، ج ۴، ص ۹۰

[3] المقدسی، شرف الدین، الاقناع، ج ۳، ص ۵۱

[4] الحلی، شرائع الاسلام، ص ۲۵۰

[5] ابن رشد، محمد بن احمد بن احمد بن محمد، بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد، مطبع حمالیہ قاہرہ ۱۳۲۹ھ، ج ۲، ص ۳۳۶

[6] المائدہ ۵: ۱۰۶

[7] الابی، جواہر الاکلیل شرح مختصر خلیل، ج ۲، ص ۳۲۵؛
الشیرازی، الفیروزآبادی، المہذب، ج ۲، ص ۳۳۴؛
المقدسی، شرف الدین، الاقناع، ج ۳، ص ۴۷؛
الحلی، شرائع الاسلام، ص ۲۶۲،

دارالاسلام کے غیر مسلم شہری کی شہادت بھی جائز ہوگی[۱] البتہ المحرر میں لکھا ہے کہ ایک روایت میں غلطی وصیت باوجود شہادت قائم کر دینے کے صحیح نہ ہوگی[۲] لیکن یہ قول امام احمد سے منسوب درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ المقنع میں اس کو لفظ" احتمال" سے تعبیر کیا گیا ہے[۳]

وصیت کے ارکان (اجزائے لازم) تین ہیں :

موصی (وصیت کرنے والا) ۔

موصی لہٗ (جس کے حق میں وصیت کی جائے) ۔

موصی بہٖ (جس بات کی وصیت کی جائے) ۔

ان تینوں ارکان کی بعض شرائط ہیں اور اس بارے میں مسالک مختلفہ تفصیل طلب ہیں ۔ موصی کے بارے میں حنفیہ کہتے ہیں کہ وہ تملیک کا اہل ہو یعنی دوسرے کو مالکانہ حق دے سکے چنانچہ ضروری ہے کہ وہ بالغ ہو ۔ ذی عقل ہو[۴] حواس باختہ نہ ہو ، اپنے کل مال کے برابر مقروض نہ ہو ۔ وصیت مذاق سے ، غلطی سے یا جبراً نہ کی ہو ۔ موت کے وقت مال وصیت کا وارث کوئی نہ ہو ۔ غلام اور مکاتب نہ ہو ۔ موصی کی زبان بند نہ ہو وغیرہ[۵]

مالکیہ نے کہا ہے کہ موصی کے متعلق دو شرطیں ہیں ایک یہ کہ وہ آزاد ہو اور دوسرے یہ کہ وہ صاحب تمیز

---

[۱] الحلی ، شرائع الاسلام ، ص ۲۶۲

[۲] مجدالدین ، ابوالبرکات ، المحرر فی الفقہ ، مطبوعہ مصر ، ج ۱ ، ص ۳۷۶

[۳] المقدسی ، ابن قدامہ ، المقنع ، مطبع سلفیہ ، ج ۲ ، ص ۳۵۶

[۴] واما الذی یرجع الی الموصی فانواع منها ان یکون من اھل التبرع فی الوصیة بالمال وما یتعلق بہ لان الوصیة بذالک تبرع بایجابہ بعد موتہ فلا بد من اھلیة التبرع فلا تصح من الصبی والمجنون ،

الکاسانی ، علاؤالدین ، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ، ج ۷ ، ص ۳۳۴

[۵] الجزیری ، عبدالرحمٰن ، کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ، ج ۳ ، ص ۳۱۶ وبعدہٗ ؛ الکاسانی ، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ، ج ۷ ، ص ۳۳۴ ، ۳۳۵ ،

ہو۔ موصی کے لیے مسلمان ہونے کی شرط نہیں ہے۔ لہٰذا کافر مسلمان کے حق میں وصیت کرے تو درست ہے اور شافعیہ نے کہا کہ وصیت کنندہ کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ بالغ، عاقل، آزاد اور مجاز ہو اور یہ کہ محجور علیہ (نااہل معاملہ) کی وصیت بھی درست ہے۔ اسی طرح حنابلہ کا بھی موقف ہے کہ موصی عاقل، صاحب تمیز ہو۔ اور یہ کہ وہ بول سکتا ہو نہ عقلی کی بنیاد پر نااہل معاملہ نہ قرار دیا گیا ہو۔ وصیت کنندہ کا مسلمان ہونا شرط نہیں ہے[1]

موصی لہٗ سے تعلق رکھنے والی بھی چند شرطیں ہیں: حنفیہ کے نزدیک یہ ہیں کہ موصی لہٗ (کسی چیز کے) مالک ہونے کا اہل ہو پس ایسے شخص کے حق میں وصیت نہیں کی جاسکتی جو مالک بننے کا اہل نہ ہو۔ وصیت کے وقت موصی لہٗ موجود ہو یا اس کی موجودگی واقع ہو۔ یہ بھی شرط ہے کہ موصی لہٗ نے موصی کو قتل نہ کیا ہو۔ موصی لہٗ کا معلوم ہونا بھی ضروری ہے البتہ موصی لہٗ کا مسلمان ہونا شرط نہیں[2]

مالکیہ کہتے ہیں کہ موصی لہٗ کا موصی بہ کا مالک ہونا درست ہو۔ موصی لہٗ کے لیے یہ شرط نہیں کہ وہ موصی کا قاتل نہ ہو۔ صیغہ کے بارے میں یہ شرط ہے کہ وہ الفاظ صریحاً وصیت پر دلالت کرتے ہوں۔ شافعیہ کہتے ہیں کہ موصی اگر مکلف ہے تو بذات خود کسی چیز کا مالک ہوسکے غرض عاقل، دیوانہ، بالغ، نابالغ بلکہ حمل کے بارے میں بھی وصیت کی جاسکتی ہے۔ جس پر مالک ہونے کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس کے حق میں وصیت کرنا درست نہیں موصی لہٗ ایک خاص اور متعین شخص ہو وصیت کسی امر مباح میں ہو اور یہ کہ حمل کے حق میں وصیت کرنا درست ہے[3]

صیغہ کے متعلق یہ شرط ہے کہ وصیت ایسی عبارت میں ہو جس سے وصیت کا مفہوم نکلتا ہو، خواہ صراحتاً یا کنایتاً۔ حنابلہ کہتے ہیں کہ موصی لہٗ موصی کا قاتل نہ ہو۔ موصی لہٗ کا مسلمان ہونا شرط نہیں صیغہ کے متعلق شرط یہ ہے کہ ایسے الفاظ ہوں جن سے وصیت کا مفہوم نکلتا ہو[4]۔

---

[1] الجزیری، کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ، ج ۳، ص ۳۱۶ وبعدہٗ،

[2] الکاسانی، علاؤالدین، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ج ۷، ص ۳۴۶ وبعدہٗ

[3] الجزیری، کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ، ج ۳، ص ۳۱۶ وبعدہٗ۔

[4] الجزیری، کتاب الفقہ، ج ۳، ص ۳۱۶ وبعدہٗ۔

موصی بہ کی شرائط یہ ہیں کہ وہ ایسی چیز ہو کہ معاملہ کے بعد ملکیت میں آسکتی ہو۔ خواہ وہ مال ہو یا منفعت، وصیت کے لیے موصی بہ کا موجود ہونا ضروری نہیں۔ موصی بہ صرف ایک تہائی ہو[1] کیونکہ اس سے زیادہ وصیت کی حضور صلعم نے اجازت نہیں دی[2] ذمی کو بھی یہی تاکید کی گئی ہے[3] اگر مرنے والے نے تہائی مال سے زیادہ کی وصیت کر دی تو اس کا نفاذ متوفی کے ورثاء کی اجازت پر موقوف ہوگا۔ اگر وہ اجازت نہ دیں تو اس وصیت کو فقط تہائی مال تک محدود کر دیا جاتا ہے[4] حنابلہ نے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ وہ مال خاص موصی کا ہو اور موصی بہ کے لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ موصی اس کے سپرد کرنے پر قادر ہو[5] ایک اور نکتہ جس پر قرآن و حدیث میں اساسی طور پر زور دیا گیا ہے، یہ ہے کہ وصیت کا مقصد کسی رشتہ دار کو ضرر پہنچانا نہیں ہونا چاہیے[6] حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ایک مرفوع روایت میں تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ ایسے شخص نے اگر ساٹھ سال تک بھی خدا کی عبادت کی ہوگی تو وہ دوزخ میں جائے گا[7]

وصیت کرنے کے لیے اگرچہ قرآن و حدیث میں جائیداد کی کم از کم مالیت کی کوئی حد بیان نہیں کی گئی۔ مگر چونکہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۸۰ میں خیراً کا ذکر آیا ہے۔ جس کے معنی مفسرین نے 'مال کثیر' کے لئے ہیں[8] لہٰذا اس سے بجا طور پر یہ تاثر ملتا ہے کہ تھوڑے مال میں وصیت کرنا جائز نہیں۔ چنانچہ

---

[1] الکاسانی، بدائع الصنائع، ج ۷، ص ۳۴۰

[2] البخاری، الجامع ، ج ۱، ص ۳۸۴ ؛ ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، ص ۱۹۵ ؛ الترمذی، ابوعیسٰی، محمد بن عیسٰی، الجامع الترمذی، ایم۔ ایچ۔ سعید کمپنی کراچی، وصایا باب ۱،

[3] البخاری، الجامع الصحیح، ج ۱، ص ۳۸۴

[4] المرغینانی، برہان الدین علی بن ابی بکر، الہدایۃ، مطبوعہ کراچی، ج ۲، ص ۱۴۶ وبعدہ۔

[5] الجزیری، کتاب الفقہ، ج ۳، ص ۳۱۶ وبعدہٗ

[6] دیکھیے النساء، ۴ : ۱۲

[7] البغوی، معالم التنزیل، ج ۱، ص ۳۹۹

[8] آلوسی، روح المعانی، ج ۲، ص ۵۲

حضرت عائشہؓ نے تین ہزار درہم[1] اور حضرت علیؓ نے تین سو یا چار سو[2] دینار کو قلیل مال قرار دیتے ہوئے پوچھنے والوں کو وصیّت کرنے سے منع فرمایا۔ حضرت قتادہ تابعی نے ایک ہزار دینار کو خیر، کا مصداق قرار دیا[3]

وراثت کے بیان میں گو وصیّت کا ذکر قرض (دین) سے مقدم آیا ہے[4] مگر نبی کریم صلعم نے ہمیشہ قرض کو وصیّت پر مقدم فرمایا۔ اسی بنا پر فقہ میں کفن دفن کے اخراجات اور قرض کی ادائیگی کو وصیّت کے نفاذ پر مقدم حیثیت دی جاتی ہے[5]

مسلمان ذمی کے لیے اور ذمی مسلمان کے لیے وصیّت کر سکتا ہے اور مرتے وقت کوئی شئے کسی کو ہبہ کے طور پر دینا بھی وصیّت ہے[6] تمام فقہاء کے نزدیک وصیّت سے رجوع جائز ہوگا[7] البتہ وصیّت سے انکار کرجانا امام ابو یوسفؒ کے نزدیک رجوع ہوگا اور امام محمدؒ کے نزدیک رجوع نہ ہوگا[8]

آخر میں یہ بیان کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ممالک میں وصیّت سے متعلق جدید قانون سازی گذشتہ پچاس سال سے جاری ہے۔ سب سے پہلے حکومتِ مصر نے قانون الوصیۃ مجریہ ۱۹۴۶ء نافذ کیا اس کے بعد شام، تیونس، مراکش اور عراق میں بھی قانون الاحوال الشخصیہ کے تحت قانون الوصیّۃ کو مدوّن کیا گیا۔

مغربی پاکستان میں ۱۹۶۲ء میں جو پرسنل لا نافذ کیا گیا اس میں وصیّت کو بھی ان امور میں شامل کر لیا گیا جن پر اسلامی قانون کا علی العموم اطلاق ہوگا۔ عرف و رواج کی قانونی حیثیت اسلامی قانون کے مقابلہ میں منسوخ و غیر نافذ قرار پائی۔ چنانچہ آج پاکستان میں جو قانون وصیّت نافذ ہے وہ حنفی اور شیعی فقہاء کے

---

۱ البغوی، معالم التنزیل، ج ۱، ص ۳۹۹

۲ ابن کثیر، عماد الدین، تفسیر القرآن العظیم، ج ۱، ص ۲۱۱، ۳ ایضاً: ص ۲۱۱

۴ دیکھو النساء: ۴: ۱۱، ۱۲

۵ البخاری، الجامع الصحیح، ج ۱، ص ۳۸۵، ترمذی، جامع الترمذی، کتاب الوصایا باب ۵

۶ المرغینانی، ہدایۃ، ج ۲، ص ۲۴۲

۷ المرغینانی، ہدایۃ، ج ۲، ص ۲۴۱

۸ الکاسانی، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ج ۷، ص ۳۷۸

۹ ایضاً، ج ۷، ص ۳۸۰

مفتی بہ اقوال کے مطابق ہے اس قانون کو مدون کرنے کے لیے ڈاکٹر تنزیل الرحمن نے ۱۹۷۱ء میں شاندار کوشش کی اور کافی حد تک اس کوشش میں کامیاب رہے۔ لیکن اسلامی قوانین کی ترتیب نو اور تدوین جدید کا کام اپنی وسعت اور پھیلاؤ کے اعتبار سے مشکل اور کٹھن ہے۔ اور کسی فرد واحد کے بس کی بات نہیں بس ایک جذبہ بے اختیار اور شوق کی وجہ سے ہم نے بھی بمطابق حیثیت اس کارِ خیر میں حصہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین۔